بھارتی حکومت کے گہرے مراسم قائم ہیں۔لیکن اگر ہم دیکھیں کہ جنرل ضیاء الحق کے طیارے میں ایک امریکی بھی موجود تھا جبکہ ان کے قتل میں امریکہ ملوث تھا اور عالمی تجزیہ نگاروں کے مطابق امریکہ، اسرائیل اور بھارت، پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں تو یقیناً اسرائیل کو جواز مہیا کرنے کے لیے بھارت نے اسرائیلی فیملی کو نشانے پر رکھا۔

(۴) توجہ طلب امر یہ بھی ہے کہ اسرائیلی کمانڈوز ایک گھنٹے کے اندر اندر واقعہ کی تحقیقات کی غرض سے بھارت پہنچ گئے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے یا ساری دال ہی کالی ہے۔

(۵) اسرائیل اور امریکہ، بھارت کے اس ڈرامائی سین کو فلاپ سمجھتے ہوئے واضح طور پر کہہ رہے ہیں کہ یہ بھارت کا اندر کا معاملہ ہے، اس میں پاکستان ملوث نہیں ہے۔اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی لیکن یاد رہے کہ اسرائیل اور امریکہ ہمارے ساتھ مخلص نہیں بلکہ جب صدر آصف زرداری اور عسکری ذرائع نے شمالی وزیرستان کے علاقوں سے پاکستان کی فوج ہٹانے کی بات کی تو امریکہ کو اپنی موت نظر آئی جس کی وجہ سے امریکہ اور اسرائیل نے یہ بیان دے دیا کیونکہ انہیں ابھی وہاں ہماری ضرورت ہے۔

(۶) اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ افغانستان میں ''را'' کے ایجنٹ موجود ہیں اور وہاں ان کا مضبوط نیٹ ورک موجود ہے اور وہ اکثر و بیشتر پاکستان میں دھماکے کراتے رہتے ہیں۔سربجیت سنگھ اس کی واضح اور زندہ مثال ہے۔ پاکستان میں میریٹ ہوٹل اور دیگر مقامات میں جو خودکش حملے یا بم دھماکے ہوئے، اسے جاننے کے باوجود کہ ''را'' کے اہلکار پاکستان کے خلاف یہ سب کچھ کروا رہے ہیں اور ان کے ساتھ اسرائیلی خفیہ تنظیم ''موساد'' کا تعاون ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے بھارت کا نام تک نہیں لیا۔ان خودکش حملوں کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔لیکن ہمارے حکمران ''تعلقات خراب نہ ہو جائیں'' جیسی سوچ کا شکار ہو کر سب کچھ جان کر بھی انجان بنے دیکھتے رہے۔دوسری طرف بھارتی وزیراعظم اور سربراہانِ حکومت اور خفیہ ایجنسیوں کے افسران بالا نے ملزمان گرفتار ہونے سے پہلے ہی پاکستان پر الزام لگانا شروع کر دیا تھا۔یعنی بچہ پیدا نہیں ہوا اور نام پہلے ہی رکھ لیا۔

یہ ہندو لالے شروع دن ہی سے مسلمانوں کے عموماً اور پاکستان کے خصوصاً دشمن ہیں۔یہ ڈرامہ انھوں نے امریکیوں کی نقالی میں رچایا ہے کہ اگر امریکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ڈرامہ رچا کر افغانستان کو تباہ کر سکتا ہے اور اگر امریکہ جوہری ہتھیاروں کا ڈرامہ رچا کر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے تو ہم اوبرائے ہوٹل اور تاج ہوٹل کا ڈرامہ بنائیں اور پھر پاکستان اور کشمیر کو تباہ کر کے اپنے زیر کر لیں۔لیکن بھارتی لالے یہ یاد رکھیں تو اچھا ہے کہ ؎

ہم خاموش ہیں کہ درہم نہ ہو عالم کا نظام
ناداں یہ سمجھ بیٹھے کہ قوتِ انتقام نہیں

قومی زبان اور طبقاتی تعلیمی نظام

محمد جاوید اختر O

علم، تحقیق اور ٹیکنالوجی کسی خاص زبان کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ انھیں کسی قوم تک پہنچانے کے لیے کسی ایسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہوتا ہے جو اس قوم میں بولی اور سمجھی جاتی ہو تا کہ لوگ اپنی توانائیاں کوئی نئی زبان سیکھنے کی بجائے حصولِ علم پر صرف کریں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انبیاء کرام علیہم السلام کو انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ چونکہ مقصود ہدایت پہنچانا تھا لہٰذا اس کے لیے اسی قوم ہی کی زبان منتخب کی گئی جس قوم کے پاس نبی بھیجا گیا۔ قرآن مجید میں ہے ''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول سوائے اس کے کہ اس قوم کی زبان میں سے ہوتا کہ (ہماری ہدایت) کھول کھول کر بیان کر دے۔'' (ابراہیم:۴) اقوام متحدہ نے اسی اصول کو حصولِ تعلیم کی بنیادی شرط کے طور پر تسلیم کیا اور اس کے چارٹر کے مطابق ہر بچے کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام مثلاً امریکہ، برطانیہ، جاپان، جرمنی، فرانس، چین، روس، اٹلی اور کوریا نے اسی یونیورسل اصول کو اپنا کر ترقی کی منازل طے کیں۔ جبکہ پاکستان میں قومی زبان اردو کی بجائے ایک بدیسی زبان انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے طلباء کی تمام توانائیاں انگریزی سیکھنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اصل مقصد یعنی حصولِ علم و تحقیق ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

یورپی اقوام نے تحریک احیائے علوم کے دوران اپنے مروجہ روایتی نظریات کی روشنی میں اپنی ہی زبانوں میں نظامِ تعلیم رائج کر کے ترقی کی منازل طے کیں۔ برطانوی لوگ اصلاً قوم علم و تہذیب سے نابلد انگلو سیکسن قبیلہ کے خانہ بدوش تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں ان کا ایک مفکر جیفری چوسر انگریزی زبان کو پہلی مرتبہ ضبطِ تحریر میں لایا۔ اس کے خیال میں قومی تشخص قائم کیے بغیر ان خانہ بدوشوں کی ترقی ممکن نہیں اور قوم کی شناخت اور تشکیل کے لیے اپنے ہی مروجہ نظریات کی روشنی میں اپنی ہی زبان میں علم کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد شیکسپیئر، ملٹن اور سپینسر وغیرہ کے ہاتھوں یہ زبان ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی دنیا میں راج کرنے لگی۔ اسی طرح یورپ کی دیگر اقوام نے اپنے نظریات کی روشنی میں اپنی ہی مروجہ زبانوں میں کام کر کے ترقی کی۔ حالانکہ اس وقت ان کی زبانیں علاقائی بولیوں سے بھی زیادہ پسماندہ تھیں لیکن انھیں یہ حقیقت سمجھ آ گئی کہ اپنے نظریات اور زبان کے فروغ کے علاوہ ترقی کا کوئی دوسرا راستہ ہے ہی نہیں۔

O رابطہ: muhammad_javedakhtar@yahoo.com

تصور کریں کہ اگر انگریزوں یا امریکیوں پر آج چینی یا جاپانی زبان و کلچر مسلط کر دیئے جائیں تو ان اقوام کی سیاسی، معاشی اور صنعتی ترقی کا حال بھی ان کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کی طرح ابتر ہو جائے گا۔

سرسید احمد خان نے اپنے انگلستان میں قیام کے دوران (اپریل ۱۸۶۹ء تا اکتوبر ۱۸۷۰ء) اس حقیقت کا بغور مشاہدہ کیا کہ یورپی اقوام کی ترقی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان اقوام نے تعلیم و تحقیق کے لیے اپنی قومی یا مادری زبان ہی کو رائج کیا ہے۔ سرسید نے اس حقیقت کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم وفنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم وفنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں، یا فارسی، عربی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم وفنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے، ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔ جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں ان کو دیئے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی زبان میں نہ لیے جائیں تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔'' (مسافرانِ لندن۔ ص ۱۹۷)

لیکن اس وقت ہندوستان کے حالات مختلف تھے۔ انگریز کی بدیسی حکومت قائم تھی۔ متحدہ ہندوستان میں مختلف زبان و کلچر کی حامل بہت سی قومیں آباد تھیں اور لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی نافذ ہو چکی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں انگریز کے وفادار اور مغربی تہذیب کے علمبردار افسران اور اساتذہ پیدا کرنا تھا۔ اس پالیسی کے تحت اکثریتی آبادی کی حامل ہندو قوم نے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی اور مسلمانوں کے جاہل رہ جانے کا خدشہ تھا۔ اس بنا پر سرسید نے مقبوضہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کے لیے اپنی رائے تبدیل کی۔ وہ ۱۸۸۱ء میں اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' ص ۱۳۳، ۱۳۲ پر اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے کی وجہ بیان کرتے ہیں:

> ''جن ملکوں نے اس زمانے میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے تمام علوم وفنون کو اپنی زبان میں کر لیا ہے۔ مگر جن ملکوں نے ایسا کیا ان میں اور ہندوستان میں بڑا فرق ہے۔ ان ملکوں میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے۔ مگر

ہندوستان میں نہ ہندوستانی حکومت کرتے ہیں، نہ یہاں کی زبان حکمران ہے۔''

سرسید کی دوسری رائے ایک مخصوص ماحول اور حالات کے جبر کے تحت اختیار کی گئی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک آزاد اور خود مختار نظریاتی ریاست میں فروغِ تعلیم، تحقیق، ترقی اور نظریاتی ہم آہنگی کے لیے انتہائی مضر، غیر فطری اور ملکی یکجہتی کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی تھی اور یہ رائے آزادی کے فوراً بعد ترک کر دینی چاہیے تھی۔ لیکن گزشتہ باسٹھ سال سے بعض کالے انگریزوں کی مستقل مزاجی کے سبب ساری قوم اس غلط پالیسی کے تسلسل اور اس کے منفی اثرات کی زد میں ہے۔

عملی طور پر دنیا میں ترقی یافتہ ممالک پر ایک نظر دوڑائیں تو سب ممالک نے انھیں راستوں پر چل کر اپنی ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں بدترین تباہی اور کامل شکست کے بعد جاپانیوں نے سوائے نظامِ تعلیم کے تمام امریکی شرائط پر ان سے معاہدہ کیا۔ نظامِ تعلیم کے متعلق جاپانی بادشاہ کا مؤقف یہ تھا کہ ہم جاپانی قوم کا وجود ختم نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اپنے ہی نظریات کی روشنی میں اپنی زبان ہی میں تعلیم دیں گے۔ اس اصول پر یکسو ہو کر کام کر کے جاپانیوں نے کتنی ترقی کی، سب کے سامنے ہے۔ امریکہ آبادکاروں کی سرزمین ہے۔ ان میں کوئی فکری یا نظریاتی ہم آہنگی نہیں تھی۔ البتہ اکثریت انگریزی بولنے والوں کی تھی۔ سول وار کے بعد انھوں نے قومی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اپنے نظامِ تعلیم کو بڑی احتیاط سے ترتیب دیا۔ یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے تدریس ونصاب (Department of Curriculum & Instruction) قائم کیے۔ ان اداروں کی تحقیقات کی روشنی میں تعلیمی درجہ بندیاں کیں اور ایسے سلیبس متعارف کرائے اور ان پر علم درآمد یقینی بنایا کہ امریکی تعلیمی اداروں میں ایسا ذہن پرورش پائے جو فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں خواہ کسی بھی شعبہ زندگی سے وابستہ ہو لیکن اس کی ترجیحات میں امریکی مفادات مقدم ہوں۔ آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ رائے کے تمام دعووں کے باوجود امریکہ میں کسی غیر ملکی تعلیمی ادارے کا قیام تو درکنار، وہاں کسی غیر ملکی شہری کو نہ تو پرائمری سطح کے کسی تعلیمی ادارے میں پڑھانے کی اجازت ہے اور نہ ہی کوئی غیر ملکی کسی بھی سطح کے تعلیمی ادارے کا سربراہ ہوسکتا ہے۔ ان کے خیال میں اس طرح امریکی معاشرے پر غیر ملکی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں جو امریکی قوم کی یک جہتی کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا امریکی مفاد اسی میں ہے کہ ان اثرات کے اسباب کو روکا جائے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان پر چونکہ انگریز کی حکومت تھی۔ لہٰذا انھوں نے نہ صرف عمومی تعلیمی نظام اپنے مفادات کے مطابق ترتیب دیا بلکہ یہاں ایک طبقاتی نظام متعارف کرایا۔ انگریزی کو دفتری اور فوجی زبان قرار دیا گیا۔ یہ سب فیصلے انگریز حکومت کے مفادات کے تحفظ کے لیے تھے جنھیں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد یکسر بدل دیا جانا چاہیے تھا۔ قائداعظم اس معاملے میں اس قدر سنجیدہ تھے کہ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے انگریزی لباس تک کو ترک کر دیا تھا۔